شریعت اسلامیہ اور وضعی قوانین کا تقابلی جائزہ

(عصرِ حاضر کے تناظر میں)

ڈاکٹر سید عبدالمالک آغا
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ

اسلامی قانون اور وضعی قوانین کا موازنہ اس قدر وسیع موضوع ہے کہ محض ایک مضمون میں اس کی تمام جہات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں اس کی چند امتیازی خصوصیات کا تحقیقی جائزہ لیا جائے گا۔

تاریخی طور پر وضعی قوانین کا آغاز یونان سے ہوتا ہے اور رومانوجی لحاظ سے غالب آجانے کے بعد ادبی اور قانونی نقطہ نظر سے یونان کا خوشہ چین رہا ہے۔ قانون روما ایک انسانی قانون ہے اور دنیا کا سب سے پہلا مجموعہ قوانین ہے۔ براعظم یورپ کا قانون رومن لا سے ماخوذ ہے۔ جبکہ اسلامی قانون کی اساس وحی الٰہی ہے۔ اس کی بنیادی ساخت میں کسی انسانی دماغ کا عمل دخل نہیں۔ قانون الٰہی حضرت آدم علیہ السلام کے عہد سے چلا آ رہا ہے جس کی تکمیل بعد میں قانون اسلامی کی شکل میں ہوئی۔

قانون، اخلاق اور مذہب کا باہمی ارتباط:

مغربی ماہرین قانون اور علمائے اخلاق کے مابین قانون اور اخلاق کے باہمی ربط کے اعتبار سے اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مغرب میں دو طرح کے مفکرین موجود رہے ہیں۔ (۱) مذہبی مفکرین اور آزاد خیال دانشور۔ اسی طرح سیکولر رجحانات کی نمائندگی کرنے والے ماہرین بھی دو طبقات میں بٹے

ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن میں سے بعض وہ ہیں جو قانون کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہینز کیلسن (Hans Kelson) نے مجرد نظریۂ قانون پیش کیا ہے۔ وہ قانون اور اخلاق کے باہمی رشتے کا سخت مخالف ہے۔ جیسا کہ جسٹس تنزیل الرحمٰن نے لکھا ہے:

> ''مشہور انقلابی مفکر کیلسن (Kalson) اخلاقی تصورات کو قانون میں سمو دینے کا سخت مخالف ہے۔ اس کے خیال میں اخلاقیات محض ایک موضوعی (Subjective) چیز ہے اس لئے اس کو قانون کے سائنسی مطالعہ میں بحیثیت معروضی حقیقت کے شامل نہیں کیا جا سکتا۔''(۱)

ہینز کیلسن (Hanes Kelson) کے علاوہ جان آسٹن (John Austin) راسکو پاؤنڈ (Roscoe Pound)، ہارٹ (Hart)، راز (Raz) اور ہابز (Hobbes) بھی مجرد نظریۂ قانون کے پر زور حمایتی ہیں جبکہ گرے (Gray)، فرائڈ مین (Fried man) اور سالمنڈ (Salmond) وغیرہ قانون کی مقصدیت کے قائل ہیں۔ مجرد نظریۂ قانون کی خامی یہ ہے کہ قانون محض حکم سے عبارت ہے جس کی اطاعت بہرصورت لوگوں کے لئے ضروری ہے۔ اس میں ہر قسم کی خرابی کے باوجود اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا چنانچہ الفرڈ ڈینگ (Alfred Denning) نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

> **''It (Law) Lays down rigid rules which must be obeyed with out questioning whether they are right or wrong. Its function is to keep order nor to do justice''**
>
> (قانون جامد قواعد وضع کرتا ہے جن کی اطاعت کی جانے چاہئے اور یہ سوال نہ کیا جائے کہ یہ صحیح ہیں یا غلط۔ قانون کا کام یہ ہے کہ حکم کی تعمیل کی جائے نہ کہ انصاف سے کام لیا جائے۔)

مغربی مفکرین اور دانشوروں میں سے بعض وہ ہیں جو قانون کی مقصدیت و افادیت کے حامی ہیں۔ ان کے خیال میں قانون میں اخلاقی عنصر بہرصورت شامل ہے۔ قانون کو انصاف کے تعلق سے

پہچانا جاتا ہے۔ قانون کا منشاء محض حکم دینا نہیں بلکہ اس کا مقصد اصلاح ہے۔ گویا ان کے خیال میں قانون پتھر نہیں ہے بلکہ اس کا مصلحت و افادیت پر مبنی ہونا لازمی ہے۔ پس مغرب میں قانون اور اخلاق کے دو معیاری نظام پائے جاتے ہیں۔ بتصریح جسٹس تنزیل الرحمٰن:

> ''مغربی فلاسفہ اور ماہرین قانون اس نظریے کے حامل نظر آتے ہیں کہ انسانی معاشرے میں بیک وقت قانون اور اخلاق کے دو معیاری نظام (Normative Systems) پائے جاتے ہیں اور یہ دونوں نظام بعض مقامات پر ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔''(۳)

الغرض قانون کی دنیا میں جو مسائل انتہائی مشکل اور لاینحل سمجھے جاتے ہیں ان میں سے ایک نہایت اہم مسئلہ قانون اور اخلاق کے باہمی ربط کا بھی ہے۔ قدیم دور کے قوانین ہوں یا جدید دور کے ترقی یافتہ مغربی قوانین ہوں' دونوں کو سب سے زیادہ جس مشکل مسئلہ نے پریشان کیا وہ قانون اور اخلاق کے باہمی ربط ہی کا مسئلہ تھا۔ مغربی قوانین اس حوالے سے ایک شدید کشمکش کا شکار ہیں۔

قوانین جدیدہ کے علاوہ دو بڑے الہامی مذاہب یہودیت اور نصرانیت بھی قانون اور اخلاق کے باہمی ارتباط کے حوالے سے افراط وتفریط کے شکار ہیں چنانچہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

> ''توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق' اسی لئے یہ دونوں الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لئے پوری طرح کافی نہیں۔''(۴)

قانون' اخلاق اور مذہب کے باہمی تعلق سے متعلق بھی مغربی ماہرین قانون کے تصورات مختلف ہیں(۵) چنانچہ ایک جماعت آزاد خیال مفکرین کی ہے جو قانون کے ذریعے نفاذ اخلاق کی سرے سے قائل ہی نہیں۔ جبکہ بعض محض عقلی (Rational) اخلاق کے نفاذ کی حد تک متفق ہیں ان کے خیال میں مذہبی اخلاق چونکہ غیر عقلی (Non-rational) ہیں اس لئے بذریعہ قانون ان کا نفاذ نفع بخش نہیں ہے۔ ایک گروہ ان عیسائی مفکرین پر مشتمل ہے جو قانون' اخلاق اور مذہب کے باہمی ربط کا پرزور حمایتی ہے۔

ہارٹ (Hart)' ہیوز (Hughes) اور ہینکن (Hankin) ایک مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ محض عقلی (Rational) اخلاق کے نفاذ کے قائل ہیں ان کے خیال میں مذہبی اخلاق چونکہ غیر عقلی ہوتے ہیں اس لئے قانون کے ذریعے انہیں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔(۶)

علاوہ ازیں بینتھم (Jermy Benthem)' بلیک اسٹون (Black Stone)' آسٹن (Austin) اور ہینز کیلسن (Hans Kelsen) وغیرہ نے قانون' اخلاق اور مذہب کے باہمی تعلق سے قطعی طور پر انکار کیا ہے اور انہوں نے اخلاقی قدروں کو قانون سے خارج کرنے کا نظریہ اپنایا ہے۔(۷)

اس کے برعکس ایک طبقہ ان مفکرین کا ہے جن کے خیال میں اخلاق کا منبع و مصدر مذہب ہے چنانچہ ایک مغربی مفکر کا بیان ہے:

> "One theory, which appears to be lord Delvlin, is that the whole of our morality is logically dependent upon christain"
>
> (لارڈ ڈیولن کا نظریہ یہ ہے کہ ہمارا اخلاقی نظام منطقی طور پر عیسائی عقائد پر منحصر ہے۔)

قدیم زمانوں میں مذہب' اخلاق اور قانون آپس میں مربوط تھے۔ الفرڈ ڈیننگ (Alfred Denning) نے اس تاریخی حقیقت کو یوں بے نقاب کیا ہے:

> " In primitive communities, religion, morals and law were indistinguishably mixed together."(9)
>
> (قدیم معاشروں میں مذہب' اخلاق اور قانون ایک دوسرے سے ناگزیر طور پر جڑے ہوئے تھے۔)

موصوف (Alfred Denning) اس سلسلے میں مزید رقمطراز ہے:

> "That if we seek truth and justice, we can not find it by

argument and debate, nor by reading and thinking, but only by the maintenance of true religion and virtue. Religion concerns the spirit in man . Where by he is able to recognise what is truth and what is justice. Where law is only the application."(10)

(اگر ہم سچائی اور انصاف کو تلاش کریں تو ہم انہیں بحث و مباحثہ کے ذریعے دریافت نہیں کر سکتے اور نہ ہی پڑھنے اور سوچنے سے' بلکہ صرف اس طرح پا سکتے ہیں کہ مذہب اور نیکی کو قائم رکھیں۔ مذہب کا تعلق انسان کی روح سے ہے' جس کے ذریعے وہ جان سکتا ہے کہ سچائی کیا ہے اور انصاف کیا ہے جبکہ قانون صرف اطلاق کا نام ہے۔)

لیکن جو مغربی مفکرین قانون' اخلاق اور مذہب کے باہمی ارتباط کے مدعی ہیں۔ وہ اقلیتی گروہ ہے۔ موجودہ دور میں ان کے افکار و نظریات عملاً غیر موثر' متروک اور نا قابل عمل تصور کئے جاتے ہیں۔ بیشتر مغربی قوانین میں اخلاقی تصورات کو قانون کے دائرے سے یکسر خارج کر دیا گیا ہے وہاں اب جو قانونی نظریات زیر بحث ہیں۔ ان میں مذہب اور اخلاق کا حوالہ بے معنی ہے۔

اس کے علی الرغم شریعت اسلامیہ نے قانون' اخلاق اور مذہب کے باہمی ارتباط کا ایک مکمل اور جامع تصور پیش کیا ہے۔ اسلامی قانون کا ہر حکم اپنی اساس مذہبی عقائد اور اخلاقی اقدار پر رکھتا ہے۔ الغرض اسلام میں قانون' اخلاق اور مذہب کا منبع ایک ہے یعنی وحی الٰہی جو قرآن و سنت نبوی سے عبارت ہے۔

مآخذ کا فرق:

شریعت اسلامیہ اور قوانین جدیدہ باعتبار مآخذ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ وضعی قوانین کے مآخذ قانون سازی' رسم و رواج' عدالتی فیصلے اور افراد کی رائے عامہ ہیں۔ چنانچہ سالمنڈ (Salmond) نے قانون کے مآخذ کی درجہ بندی یوں کی ہے:

"Salmond classifies "Sources of Law" into Formal and Material, then divides material sources into historical and legal and further subdivides legal sources into legislation, precedent, custom and agreement."(11)

(سالمنڈ قانون کے مآخذ کو دو درجوں میں تقسیم کرتا ہے (۱) رسمی مآخذ (۲) مادی مآخذ ۔ پھر وہ مادی مآخذ کو مزید دو قسموں میں منقسم کرتا ہے۔ (الف) تاریخی مآخذ ب۔ قانونی مآخذ)

موصوف (Salmond) نے قانونی مآخذ کی اقسام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

(۱) مقننہ (Legislation) (۲) نظائر (Precedents)

(۳) رسم ورواج (Custom) (۴) معاہدے (Agreement)۔(۱۲)

ہربرٹ بروم (Herbert Broom) نے وضعی قانون کے مآخذ کی تفصیلات یوں بتائی ہیں:

"Our common law has come to us from very many sources, ... from the corpus juris of justinian, from our Anglo- Saxon ancestors, fragments of whose codes are extant from customs handed down to us by tradition, from mercantile, from the charters of our kings,... from enactments of the legislature and from decided cases, has the common law of England been derived,"

(ہمارا قانون عامہ کئی مآخذ سے ہم تک پہنچا ہے۔..... ہمارے اینگلو سیکسن آباؤ اجداد سے جن کے مجموعہ ہائے ضوابط کے کچھ حصے اب تک باقی ہیں' رواجات سے جو روایات کے ذریعے ہم تک پہنچے' تجارتی استعمالات سے' ہمارے بادشاہوں کے فرامین سے' قانون ساز اداروں کے وضعی قوانین سے اور مقدمات کے فیصلوں سے انگلستان کا قانون عامہ' ان سب سے اخذ کیا گیا ہے۔)

مزید برآں ایک مغربی ماہر قانون نے مآخذ قانون کی دیگر صورتوں کا تذکرہ یوں کیا ہے:

(i) قانونی ضرورت (Jural Necessity)

(ii) خودمختار قانون (Autonomous Law)

(iii) اصول قانون (The Science of Law)(۱۴)

پس شریعت اسلامیہ قانون سے اس لحاظ سے مختلف یہ ہے کہ قانون کے تمام تر مصادر مادی ہوتے ہیں جو انسان ذہن کے تراشیدہ ہیں بالفاظ دیگر قانون چونکہ انسانوں کی ایجاد ہے اس لئے اس میں انسانی ضعف اور قلت فہم موجود ہے یہی سبب ہے کہ قانون میں ہمہ وقت تغیر وتبدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ زمان و مکان کے اختلاف کے لحاظ سے مغربی مصاد قانون کی قانونی اہمیت میں خاطر خواہ تبدیلی ہوتی رہی ہے مثال کے طور پر نظیر (Precedent) جو ایک اہم مآخذ قانون کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی قانونی حیثیت و اہمیت میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی رونما ہوتی رہی ہے دوسری جانب قانون سازی کی بحیثیت مصدر قانون اہمیت میں حد درجہ اضافہ ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ مغربی مآخذ قانون تغیر پذیر ہونے کے علاوہ مبہم بھی رہے ہیں۔ رابسن (Robson) نے اس تاریخی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے:

"The origins of law are shrouded in obscurity and are, perhasps, impossible to discover."(15)

(قانون کے مآخذ ابہام کے دبیز پردوں میں چھپے ہوئے ہیں جنہیں منصۂ شہود پر لانا شاید ناممکن ہے)

الغرض وضعی قانون کے تمام تر مآخذ کوتاہ نظری کا شکار ہوتے ہیں۔ ان بنیادوں پر جو ضوابط بھی تشکیل پاتے ہیں۔ قانون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

اسلامی قانون کے مآخذ: (Sources Of Islamic Law)

ماخذ عربی زبان کا لفظ ہے۔ ماخذ وہ مقام ہے جہاں سے کچھ اخذ کیا جائے۔ ماخذ کی جمع مآخذ

ہے۔شرع کی اصطلاح میں ماخذ وہ جگہ ہے جہاں سے شرعی احکام حاصل کئے جاتے ہیں۔اصول فقہ کی کتابوں میں مآخذ کو اصول احکام اور ادلۃ الاحکام بھی کہتے ہیں۔ نیز انہیں تشریعی مصادر بھی کہتے ہیں۔ اسلامی قانون کے بنیادی مآخذ حسب ذیل ہیں:

(۱) قرآن

(۲) سنت نبویؐ

(۳) اجماع

(۴) قیاس

علاوہ ازیں کچھ ثانوی مراجع ایسے ہیں جن سے متعلق علماء کا اختلاف ہے جو حسب ذیل ہیں:

i- استحسان

ii- استصلاح (مصالح مرسلہ)

iii- استدلال

iv- عرف (مقامی رسم ورواج)

v- ماقبل کی شریعت

vi- تعامل

vii- مسلمہ شخصیتوں کی رائیں

viii- ملکی قانون

اس طرح فقہ اسلامی کے بنیادی اور ثانوی مصادر و مراجع فنی حیثیت سے بارہ (۱۲) ہیں۔ شرعی احکام کے مآخذ کی فقہاء نے ایک دوسرے انداز میں بھی درجہ بندی کی ہے جو یوں ہے: نقلی مآخذ اور عقلی مآخذ۔

حاصل کلام یہ کہ اہل مغرب کو قانون، اخلاق اور مذہب تینوں کا اشتراک گوارا نہیں ہے۔ ان کے ہاں ان تینوں کے مآخذ جدا جدا ہیں جبکہ اسلام میں نہ صرف یہ تینوں آپس میں مربوط ہیں بلکہ ان کا سرچشمہ بھی ایک ہے یعنی وحی الٰہی۔ گویا باعتبار مآخذ شریعت اسلامیہ کو وضعی قوانین پر برتری حاصل ہے۔

شریعت اسلامیہ اور قانون کے درمیان اساسی اختلافات:

شریعت اسلامیہ قانون سے تین اساسی جہتوں میں مختلف ہے یعنی کمال، رفعت اور ہمیشگی چنانچہ عبدالقادر عودہ اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

أن الشريعة الإسلامية تمتاز على القوانين الوضعية بثلاث ميزات جوهرية:

الميزة الأولى ـ الكمال: تمتاز الشريعة الإسلامية على القوانين الوضعية بالكمال؛ أى بأنها استكملت كل ما تحتاجه الشريعة الكاملة من قواعد و مبادئ ونظريات، وأنها غنية بالمبادئ والنظريات التى تكفل سد حاجات الجماعة فى الحاضر القريب والمستقبل البعيد.

الميزة الثانية. السمو: تمتاز الشريعة الإسلامية على القوانين الوضعية، بالسمو؛ أى بأن قواعدها ومبادئها أسمى دائما من مستوى الجماعة ؛ وأن فيها من المبادئ والنظريات ما يحفظ لها هذا المستوى السامى مبهما ارتفع مستوى الجماعة.

الميزة الثالثه. الدوام: تمتاز الشريعة الإسلامية على القوانين الوضعية بالدوام؛ أى بالثبات والاستقرار، فنصوصها لا تقبل التعديل مهما مرت الأعوام وطات الأزمان وهى مع ذلك تظل حافظة لصلاحيتها فى كل زمان و مكان (١٢)

(شریعت اسلامیہ مندرجہ ذیل تین اساسی امور میں دیگر قوانین سے ممتاز ہے اور ان پر فوقیت رکھتی ہے۔)

پہلی فوقیت: کمال

شریعت اسلامیہ اپنے کمال کی بنا پر تمام قوانین پر فوقیت رکھتی ہے۔ کیونکہ ایک مکمل قانون میں جس قدر قواعد' اصول اور نظریات کی ضرورت ہوسکتی ہے وہ سب شریعت میں موجود ہیں' اور شریعت کا دامن ان تمام اصول ونظریات سے بھرا ہوا ہے جو مستقبل قریب یا بعید میں انسانیت کی ضروریات کی تکمیل کے لئے کارآمد ہوسکتے ہیں۔

دوسری فوقیت: رفعت

شریعت اسلامیہ کے قواعد اور اصول ہمیشہ سوسائٹی کے معیارات سے بلند تر رہتے ہیں اور خواہ انسانی زندگی کا معیار کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو جائے شریعت اسلامیہ میں ایسے اصول ونظریات موجود ہیں جو اس کی رفعت کو ہمیشہ محفوظ رکھیں گے اور ہمیشہ اس کا معیار انسانی معیارات سے بلند تر رہے گا۔

تیسری فوقیت: ہیشگی

شریعت اسلامیہ ثابت اور مستقل ہے اور اس میں ہیشگی کی صفت موجود ہے خواہ کتنا ہی طویل دور کیوں نہ گذر جائے اس کی دفعات میں کوئی تبدیلی اور کوئی تغیر نہیں آتا' مگر اس عدم تغیر کے باوجود شریعت ہر دور کے لائق اور ہر زمانے کے مناسب رہتی ہے۔

جرم وسزا کا تصور:

اسلامی قانون میں سزائیں بذات خود مطلوب نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہیں۔ وضعی قوانین کی طرح اسلام میں سزائیں بطور انتقام کے جاری نہیں کی جاتیں' بلکہ حدود شرعیہ کے نفاذ کا مقصد وحید اصلاح احوال اور اخلاقی اقدار کا فروغ ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے اسلامی حدود کا فلسفہ یوں بیان کیا ہے:

> "إعلم أنّ من المعاصي ماشرع الله فيه الحد وذلک کلّ معصية جمعت، وجوها من المفسدة بأن كانت فسادا في الارض واقتضابا على طمأنينة المسلمين' وكانت لها داعية في نفوس بني

آدم لا تزال تهيج فيها' ولها ضراوة لا يستطيعون الاقلاع منها بعد أن أشربت قلوبهم بها' وكان فيه ضرر لا يستطيع المظلوم دفعه عن نفسه في كثير من الأحيان' وكان كثير الوقوع فيما بين الناس' فمثل هذه المعاصي لا يكفي فيها الترهيب بعذاب الآخرة بل لا بدمن إقامة ملامة شديدة عليها وإيلام ليكون بين أعينهم ذلك فيردعهم عما يريدونه۔" (۱۷)

''جاننا چاہئے کہ بعض معاصی کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ نے حد مقرر کی ہے اور وہ ایسے معاصی ہیں جن کے ارتکاب سے زمین پر فساد پھیلتا' نظام تمدّن میں خلل پیدا ہوتا اور اسلامی معاشرے کی طمانیت اور سکون قلب ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ گناہ کچھ اس نوع کی ہوتی ہیں کہ دو چار مرتبہ کرنے سے ان کی لت پڑ جاتی ہے۔ اور ان سے باز رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کی مَعاصی میں محض آخرت کا خوف دلانا اور نصیحت کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ ایسی عبرت ناک سزا مقرر کی جائے کہ اس کا مرتکب اپنے معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اور وہ تاحیات سوسائٹی کے دیگر افراد کے لئے سامان عبرت بنا رہے اور اس کے انجام کو دیکھ کر بہت کم لوگ اس قسم کے جرم کرنے کی جرأت کریں۔''

شریعت اسلامیہ اور دنیوی قوانین میں جرم و سزا کے حوالے سے ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ وضعی قوانین میں محض دنیوی سزا کا تصور پایا جاتا ہے۔ جبکہ اسلامی قانون میں دنیوی سزا کے علاوہ اخروی سزا کا نظریہ بھی موجود ہے۔ علاوہ ازیں وضعی قانون میں قانونی اقدام کے تحفظ کے لئے صرف خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا کا تصور پایا جاتا ہے۔ یہ حفاظت قانون کا محض منفی ضابطہ ہے جبکہ اسلامی تصور قانون اس سے کہیں زیادہ جامع ہے۔ شریعت اسلامیہ میں بیک وقت مثبت اور منفی دونوں ضابطے موجود ہیں۔ یعنی اصول ثواب اور اصول عذاب۔ یہاں اگر ایک طرف خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے تو دوسری طرف قانون کی تعمیل کرنے والوں کو جزا بھی دی جاتی ہے۔

جرم اور گناہ کی تفریق:

دنیوی اور اُخروی سزا کی تقسیم سے افعال ممنوعہ میں ایک نوعیت کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ وہ جرم اور گناہ کی تفریق کا تصور ہے۔ جو گناہ اخلاقی قباحت کے لحاظ سے زیادہ سنگین ہیں انہیں جرائم کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اور بقیہ گناہوں کو معصیت کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ جرم اور گناہ کی اس تفریق سے مغربی تصور قانون آشنا نہیں ہے۔ اگرچہ وضعی قوانین میں بھی غیر اخلاقی افعال کو گناہ اور جرم میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مگر یہ تقسیم قانون اسلامی سے مختلف اور محدود ہے۔ جیسا کہ تھومس (Thomas) نے اس کی صراحت یوں کی ہے:

> "The commitee followed mill by distinguishing between crime and sin and saying that intervention by criminal law is justified only to prevent international harm caused by one person to an other."(18)
>
> ''کمیٹی نے مل کی پیروی کرتے ہوئے جرم اور گناہ میں امتیاز قائم کیا اور قانون کی مداخلت کو اسی صورت میں جائز تصور کیا جب ایک شخص کو دوسرے شخص کی طرف سے عالمی (اجتماعی) نقصان سے بچانا مقصود ہو۔''

مغربی قانون میں کوئی عمل اس وقت جرم شمار ہوگا جب اجتماعی طور پر اس کے برے اثرات مرتب ہوں۔

یہاں یہ نکتہ وضاحت طلب ہے کہ اہل مغرب کے ہاں اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟ مغربی ماہرین اخلاق نے اچھائی اور برائی سے متعلق مختلف معیارات پیش کئے ہیں۔ سی۔ ڈی براڈ (C.D. Broad) نے ان معیارات کی درجہ بندی کرتے ہوئے انہیں پانچ انواع میں تقسیم کیا ہے اور اپنی کتاب ''Five Types of Ethical Theory'' میں انہیں پیش کیا ہے۔ ولیم للی (William Lillie) نے بھی مختلف معیارات اخلاق کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

i- معیار بحیثیت قانون (The Standard as Law)

ii- معیار بطور لذت (The Standard as Pleasure)

iii- معیار بطور قدر (The Standard as Value)

iv- ارتقاء سے معین شدہ معیار

(The Standard as determined by Evolution)

v- معیار بحیثیت کمال (The Standard as Perfection) (19)

معیار بطور لذت: (The Standard as Pleasure)

اس مکتب فکر (لذتیہ) کے خیال میں لذت ہی ہمیشہ باعث عمل ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ عمل جو زیادہ سے زیادہ باعث مسرت ہو اور کم سے کم الم کا سبب ہو وہ خیر ہے اور جو عمل اس کے برعکس نتائج کا باعث ہو۔ وہ شر ہے پس مغربی قانون میں کوئی نجی بدعملی جرم کے زمرے میں شامل نہیں ہے۔ اگر اس برائی کا تعلق عالمی اقدار سے ہو تب قانون کی نظر میں اسے جرم قرار دیا جائے گا۔

اقسام لذتیت: (Kinds of Hedonism)

اس مکتب فکر کے مفکرین کو دو طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی نفسیاتی لذتیت اور اخلاقی لذتیت (Ethical Hedonism) پھر اخلاقی لذتیت مزید دو درجوں میں منقسم ہے یعنی (۱) ایغوئی اور (۲) عمومی لذتیت (Utilitarianism)

عمومی لذتیت: (Utilitarianism)

اس مسلک کے علمبرداروں نے یہ تعلیم دی ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ مسرت کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔ بقول ہچیسن: (Hutcheson)

> "Hutcheson actually stated the objective or material end, of good conduct is, the greatest hapiness for the greatest numbers, the pharase that came to be the slogan of English Utilitarianism".(20)

''بچمین نے فی الواقع یہ کہا کہ ''زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے زیادہ سے مسرت''
اچھے کردار کی غرض یا مادی غایت ہے۔ یہ فقرہ برطانوی افادیت کا نعرہ بن گیا۔''

ان تصریحات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ مروجہ قوانین میں جرم اور گناہ کی تفریق یوں کی گئی ہے کہ اخلاق کو دو اقسام پر تقسیم کیا گیا ہے یعنی نجی اخلاق اور عوامی اخلاق۔ نجی اخلاق گناہ کے زمرے میں شامل ہیں جبکہ عوامی اخلاق جرم کے دائرے میں آتے ہیں۔ اب نجی اخلاق خواہ وہ کتنے ہی خطرناک اور ضرر رساں کیوں نہ ہوں مگر ان پر قانوناً اس لئے سزا نہیں دی جاسکتی کہ یہ افراد کا ذاتی معاملہ ہے۔ ان پر سزا دینا گویا لوگوں کی شخصی آزادی میں مداخلت کے مترادف ہے۔ آج کل یورپ میں یہی اخلاقی اصول قانونی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بقول ابوالاعلیٰ مودودی:

''ان کا مقولہ یہ ہے کہ آدمی کی پبلک زندگی اور چیز ہے اور پرائیویٹ زندگی اور چیز۔ نجی زندگی کے کسی عیب پر کوئی ٹوکے تو ان کا گھڑا گھڑایا جواب یہ ہوتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ (Mind your business) اس کے بالکل برعکس آخرت کا عقیدہ ہے جو کہتا ہے کہ برائی ہر حال میں برائی ہے خواہ دنیا میں وہ مفید ہو یا نقصان دہ۔ جو شخص خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس رکھتا ہو اس کی زندگی میں پبلک اور پرائیویٹ کے دو شعبے الگ الگ نہیں ہو سکتے۔''(۲۱)

پس مغربی قانون میں جرم اور گناہ کی جس طرح درجہ بندی کی گئی ہے وہ غیر منطقی ہے جسے خود بعض مغربی مفکرین نے مسترد کیا ہے۔ چنانچہ پٹرک ڈیولن (Patrick Devlin) نے نجی اخلاق اور عوامی اخلاق کی اس غیر منطقی تقسیم کو اپنی تنقید کا نشانہ یوں بنایا ہے:

"It is wrong to talk of private morality or of the law not being concerned with immorality as such or to try to set rigid bounds to the part which the law may play in the suppression of vice."(22)

''نجی اخلاق پر گفتگو کرنا غلط ہوگا' یا یہ کہ بد اخلاقی کا قانون سے کوئی تعلق نہیں' یا یہ غلط

ہو گا کہ اس کردار کی جامد نوعیت کی حدیں مقرر کرنے کی کوشش کی جائے جو برائی کو دبانے کے لئے قانون کر سکتا ہے۔"

پارلیمنٹ اور عدالت کے ذریعے تنقید اخلاق کا مسئلہ مغربی ماہرین قانون کے درمیان دلچسپ موضوع بحث رہا ہے مثلاً برطانیہ میں قانون جرم (Criminal Law) اور عصمت فروشی (Prostitution) اور ہم جنس پرستی (Homosexuality) کے باہمی تعلق کے حوالہ سے ۱۹۵۴ء میں والفن ڈن کمیٹی (Wolfendin Committee) تشکیل دی گئی تھی۔ کمیٹی نے اخلاق اور قانون سازی (Morality and Legislation) کو زیر بحث لاتے ہوئے اخلاقیات کو ذاتی اخلاقیات (Private Morality) اور عوامی اخلاقیات (Public Morality) میں تقسیم کرنے کی سفارشات مرتب کیں۔ مذکورہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اخلاق ذمیمہ کو گناہ اور جرم کی صورت میں تقسیم کیا چنانچہ جو افعال گناہ کے زمرے میں شامل ہیں وہ قانون کے دائرے سے خارج ہیں حالانکہ ان کے منفی اثرات اور نقصانات اجتماعی طور پر واضح ہیں یہی سبب ہے کہ پیٹرک ڈیولن (Patrick Devlin) نے قانون کے ذریعے ان قبیح افعال کے سدباب پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے:

"The Suppression of vice is as much the Law's business as the suppression of subversive activities."(23)

"برائی کو دبانا قانون کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا تخریبی کاروائیوں کو دبانا۔"

الغرض جرم اور گناہ کے اس غیر منطقی تقسیم سے مغربی معاشرے پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت دنیا بھر کے سیکولر ممالک میں شرح جرائم کا گراف مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ فی زمانہ تقریباً پورے یورپ میں ایسے سنگین جرائم رواج پا چکے ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ اخلاقی اور سماجی طور پر بری طرح متاثر ہونے لگا ہے۔ قانون کے ذریعے ان جرائم کا روک تھام اس لئے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان اخلاقی برائیوں کا تعلق افراد کی نجی زندگی سے ہے۔ قانون کے ذریعے ان پر قدغن انفرادی آزادی چھین لینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کے ایک مغربی

محقق ٹی۔ پی۔ رائٹ (T.P.Wright) نے ان سماجی برائیوں کا اعتراف یوں کیا ہے:

"Abortion, divorce, homosexuality, sedomy, drug addiction, prostitution, ... profanity, blasphemy, obscenity, pornography,forgery, desertion, arson, murder and treason. Most of these forms of what had been regarded by both religion and state as immorality were rationalised as "victimless crime" or private behaviour between consenting adults."(24)

''اسقاط حمل'' طلاق' ہم جنس پرستی' لواطت' نشہ آوار اشیاء کا استعمال' قحبہ گری..... دین کی بے حرمتی' مقدس ہستیوں کی توہین' فحاشی' فحش نگاری' جعل سازی' روگردانی' (بے وفائی) آتش زنی' قتل اور غداری' ان جرائم کی کئی صورتوں کو جن کو مذہب اور ریاست دونوں نے بد اخلاقی میں شمار کیا ہے' عقلی لحاظ سے ایسے جرائم ہیں جن میں کسی کی ایذا رسانی نہیں ہوتی' یا جن میں رضا کارانہ طور پر بالغوں کا نجی رویہ کارفرما ہوتا ہے۔''

حاصل کلام یہ کہ اس وقت دنیا بھر کے سیکولر ممالک میں شرح جرائم کا گراف اوپر کو بڑھتا گیا ہے اس کا بنیادی سبب وہاں رائج وضعی قوانین ہیں جو انسداد جرائم میں ناکام رہے ہیں اس کے علی الرغم اسلامی حدود جن ممالک میں نافذ العمل رہے ہیں۔ وہاں جرائم کی شرح میں کمی واقع ہوئی ہے۔ عصر حاضر کے مفکر انیس الرحمٰن نے ان تاریخی اور موجودہ حقائق کا تذکرہ یوں کیا ہے:

''معاشرے کو بیکار کرنے کا اعتراض واقعاتی حیثیت سے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں جب کہ اس قانون کو نافذ کیا گیا' دور نبوت سے لے کر خلافت راشدہ تک صرف چھ آدمیوں کے ہاتھ کاٹے گئے اور آج بھی سعودی عرب میں یہ قانون نافذ ہے مگر برسوں گذر جاتے ہیں اور ایک بھی ہاتھ کٹنے کی نوبت نہیں آتی۔''(۲۵)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اصول:

جدید قوانین کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اصول سے متعارف ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔ ان قوانین میں مذکورہ اصول کو مطلقاً تسلیم نہیں کی گیا ہے بلکہ اسے بعض مخصوص حالات میں محدود پیمانے پر مانا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس جامع اصول کو کلی طور پر تسلیم نہ کئے جانے کے باعث ان معاشروں میں جہاں جدید قوانین نافذ العمل ہیں' جرائم فروغ پا رہے ہیں اور لوگوں کی اخلاقی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔اس کے بالمقابل اسلامی قانون کی مقصدیت تہذیب واخلاق ہے۔ اس لئے اس میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ایک جامع اصول موجود ہے تاکہ اس کے ذریعے ان تمام غیر اخلاقی برائیوں کا قلع قمع کیا جا سکے جو فرد اور معاشرے کے لئے ضرر رساں ہوں خواہ وہ جرم کے زمرے میں شامل ہوں یا گناہ کے دائرے میں اور اصول کے ذریعے ایسے تمام نیک افعال کی ترغیب دی جاتی ہے جو انفرادی اور اجتماعی طور پر نفع بخش ہوں چنانچہ عبدالقادر عودہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"وترتب على إيجاب الأمر بالمعروف والنهى عن المنكر أن أصبح الأفراد ملزمين بالتعاون على إقرار النظام وحفظ الأمن ومحاربة الإجرام ' وأن يقيموا من انفسهم حماة لمنع الجرائم والمعاصى وحماية الأخلاق ' وكان فى هذا كله الضمان الكافى لحماية الجماعة من الإجرام' وحماية أخلاقها من الانحلال. وحماية وحدتها من التفكك وحماية نظامها من الآ راء الطائشة والمذاهب الهدامة ' بل كان فيه الضمان الكافى للقضاء على المفاسد فى مكمنها وقبل ظهورها وانتشارها."(۲۶)

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لازم ہونے سے افراد ملت اس امر کے پابند ہو گئے کہ نظم ملت کو برقرار رکھیں' امن وسلامتی کا تحفظ کریں اور جرائم کو معاشرے میں پنپنے نہ دیں اور جرائم ومعاصی کے وجود کے خلاف برسر پیکار اور اخلاق کے فروغ پانے میں معاون بنے رہیں اور اس طرح معاشرے کو جرائم سے تحفظ کی معقول ضمانت اور سماجی

بے راہ روی سے بچاؤ کی کافی ضمانت میسر آ جائے اور معاشرے کی وحدت کو پراگندگی کا کوئی خطرہ نہ رہے اور اجتماعی نظام نت نئے افکار پراگندہ اور مہلک تحریکات سے محفوظ رہے' بلکہ مفاسد اور برائیاں بڑھنے اور پھیلنے سے پہلے ہی ختم کر دی جائیں۔''

دوسری طرف وضعی قوانین امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اس طرح جامع اصول سے ناآشنا ہیں بتصریح عبدالقادر عودہ:

''ولکن القوانین الوضیعة مع هذا لم تاخذ بمبدأ الأمر بالمعروف والنهی عن المنکر علی اطلاقه' وانما قصرت تطبیقه علی حالات معینة' بخلاف الشریعة التی تطبقه فی کل الحالات وفی جمیع الجرائم.''(۲۷)

''بہرحال مروجہ قوانین میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر حالات میں اس کے انطباق کو منحصر کر دیا گیا ہے جبکہ شریعت اسلامیہ اس اصول کو تمام حالات اور تمام جرائم میں منطبق کرتی ہے۔''

ان تصریحات سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ جدید قوانین امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسے جامع اصول سے محروم ہیں یہی سبب ہے کہ وضعی قوانین کلی طور پر جرائم کے تدارک سے ہمیشہ قاصر رہے ہیں کیونکہ قانون کے ساتھ ساتھ انسان کے اوپر اخلاق کا دباؤ بھی نہایت مؤثر ہے۔ اس کے برعکس اسلامی قانون' قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے اور اس میں یہ دونوں اصول بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اسلامی ریاست میں ولایۃ المظالم اور ادارۂ حسبہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کے فرائض میں شامل ہیں۔ حسبہ کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔ دوسرا مفہوم اس شخص کے فرائض سے متعلق ہے جو کسی شہر میں عوام کے اخلاق کی نگرانی کے لئے سرکاری طور پر مقرر کیا جاتا ہے پس اسلامی حکومت میں انفرادی اور سرکاری طور پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیا جاتا ہے اس لئے تاریخ میں جہاں اور جب بھی اسلامی

قانون نافذ العمل رہا ہے۔ وہاں جرائم کی شرح میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی ریاست میں عدل نافذ کرنے والے ایسے اعلیٰ ادارے موجود ہیں جو اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے وضعی قوانین میں منفرد ہیں۔ مثلاً محکمۂ قضاء، ادارۂ افتاء، ادارۂ شرطہ، ادارۂ احتساب اور دیوان المظالم وغیرہ۔

مزید برآں شریعت اسلامیہ قانون شہادت کے اعتبار سے بھی وضعی قوانین سے مختلف اور ممتاز ہے۔ ویسے تو اسلامی قانون شہادت کے اعتبار سے بہت سے امور میں جدید قوانین شہادت سے مختلف ہے۔ لیکن دو بنیادی خصوصیات ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے اسے دوسرے قوانین پر امتیاز حاصل ہے۔ جو یہ ہیں:

۱۔ نصاب شہادت۔

۲۔ تزکیۃ الشھود۔

اسلامی قانون شہادت میں گواہوں کا باقاعدہ نصاب مقرر ہے یعنی یہ پہلے ہی سے طے شدہ ہے کہ کسی جرم یا دعویٰ کے اثبات کے لئے کم از کم کتنے گواہوں کا ہونا شرط ہے۔ جدید قوانین شہادت میں اس طرح کا نصاب شہادت کا فقدان ہے۔ اسلامی قانون شہادت میں گواہوں کے حالات اور ان کے چال چلن کے بارے میں خفیہ اور اعلانیہ تفتیش کی جاتی ہے۔

کہ آیا وہ سچے ہیں یا جھوٹے؟ یہ اسلامی قانون شہادت کی ایک ایسی نمایاں ترین خصوصیت ہے کہ جس سے جدید قوانین شہادت یکسر عاری ہیں۔

شریعت اسلامیہ نظام وکالت کے لحاظ سے بھی وضعی قوانین سے یکسر مختلف ہے۔ وضعی قوانین میں وکالت کو ایک پیشہ اور ذریعہ معاش کے طور پر اپنایا جاتا ہے جبکہ اسلام میں مروجہ پیشہ وکالت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے مروجہ پیشہ وکالت سے متعلق عصرِ حاضر کے علماء اور ماہرین فقہ و قانون دو طبقات میں بٹے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک طبقہ مروجہ پیشہ وکالت کی اصلاح کے قائل ہے۔ جبکہ طبقہ دوم کا موقف یہ ہے کہ مروجہ پیشہ وکالت سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ ہے اور چونکہ یہ اسلامی نظام عدل سے متصادم اور اس کی

روح کے منافی ہے۔ گذشتہ بارہ صدیوں میں آدھی سے زیادہ دنیا پر مسلمانوں نے حکومت کی ہے اور کہیں اس کے نظام قضاء میں اس قانون پیشے کا نشان ہمیں ملتا۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مروجہ پیشہ وکالت کو ایک منصوبہ بندی کے تحت ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ ایک ایسے متبادل نظام وضع کرنے کی ضرورت ہے جو ایک طرف اسلامی نظام عدل و قضا کے مزاج اور اس کی روح کے مطابق ہو دوسری طرف عصر جدید کے تقاضوں کے موافق بھی ہو۔ بلاشبہ مروجہ طریقہ وکالت کی خرابی جو عصرِ حاضر کا ایک بہت بڑا اور سنگین مسئلہ ہے۔ قرآن و حدیث اور فقہ میں اس سے متعلق واضح ہدایات موجود ہیں۔ اسلامی ماہرین فقہ و قانون نے اس کی تمام جہات کا احاطہ کیا ہے اور اس کا متبادل نظام بھی پیش کیا ہے۔

قرآن حکیم میں وکیل کے فرائض اور اس کے اخلاق و آداب کا صریح الفاظ میں تعین کیا گیا ہے۔ قرآن و سنت کی رو سے جھوٹے مقدمے کی وکالت اور اس میں تعاون قطعاً ناجائز ہے۔ اسی طرح مشکوک مقدمات کی پیروی بھی اسلام میں حرام ہے۔ اسی طرح جھوٹ کی وکالت سے حاصل ہونے والی فیس اور جھوٹے فریق کو مدقمہ جتانے پر موصول شدہ آمدنی دونوں حرام ہیں۔ نیز وکیل اپنے موکل کے حقوق کے علاوہ فریق مخالف کے حقوق کا لحاظ رکھنے کا پابند ہے۔

آخر میں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلامی قانون کو اپنے دائرہ کار کی وسعت کے اعتبار سے مروجہ قوانین پر فوقیت حاصل ہے مثلاً شریعت زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے جبکہ قانون کا زندگی کے بعض شعبوں سے کوئی سروکار نہیں ہے جیسے عبادات' عقائد اور اخلاق قانون کے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔

الغرض قانون چونکہ انسانوں کی ایجاد ہے جس میں انسانی نقص اور قلت فہم وغیرہ موجود ہے اس لئے اس میں غلطی کا امکان بھی موجود ہے جبکہ شریعت اللہ سبحانہٗ کی نازل کردہ ہے جو منزہ عن الخطاء ہے اس لئے شریعت اسلامیہ کو وضعی قوانین پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جسٹس تنزیل الرحمٰن، مجموعۂ قوانین اسلام، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۱۹۸۱ء، ۱/۶

2- Denning, Alfred, the changing law, stevens and sons limited. london, 1953, p.99

۳۔ جسٹس تنزیل الرحمٰن، مجموعۂ قوانین اسلام، ۱/۶

۴۔ سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۳۵۷ھ، ۶/۹۴

5- Devlin, Patrick, The Enforcement of Morals, Oxford University press, London, 1968, P.3.

6- Mitechell, Basil, Law, Morality, and Religion in a secular Society, Oxford University press, London, 1967, P.104.

7- Salmond, Jurisprudence, Fitzgerald, P.J., P.L.D. Publishers, Lahore, N.D., P.15

8- Mitechell, Basil, Law, Morality, and Religion, P. 104

9- Ibid.

10- Denning, alfred, The changing Law, P.122.

11- Salmond, Jurisprudence, Fitzgerald, P.J., P.69

12- Ibid, PP.70 - 71

13- Broom• Herbert, The Philosophy of Law. Fred B. Rothman and Co. Lottleton Colorado. 1980. P.2.

14- Garies. Karl. The science of Law. Augustus M. Kelley. Publishers , New York, 1968. P.86

15- Robson. W.A.,civilization and the Growth of Law. N.D., N.P., p.10.